تعارف
طلعت عرفانی

تعارف

(तआरुफ़) (पहचान)

یہ کتاب ہریانہ اُردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی جارہی ہے

10621
31. 3.9

اِنتساب

اپنے والد

کے

۸۷/ای، ریلوے کالونی
روہتک (ہریانہ)

پہلی بار   دسمبر ۱۹۸۸ء
کتابت   جمال گیاوی
طباعت : ادے وِن آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی
سرورق   رزاق ارشد

قیمت . چالیس روپے

باہتمام:
پریم گوپال متل

پیش لفظ

ہریانہ کے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات کو منظرِ عام پر لانے کے لیے ہریانہ اُردو اکادمی نے کئی اہم منصوبے بنائے ہیں —— ان منصوبوں میں ادیبوں اور شاعروں کے مسودات کی اشاعت کے لیے معقول مالی تعاون دینا بھی شامل ہے۔ سال ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے اکادمی جن ادیبوں اور شاعروں کو یہ تعاون دے رہی ہے اُن میں طلعت عرفانی بھی شامل ہیں۔

جناب طلعت عرفانی ہریانہ کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کی فکر میں [illegible] ہیں اور ادب کے عصری ماحول کا رکھ رکھاؤ بھی۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام [illegible] افکار و اظہار کا ترجمان ہے۔
[illegible] ان کے اس کلام کو قدر کی نگاہ سے [illegible] پذیرائی ہوگی۔

[illegible] لال ذاکر
سیکریٹری
[illegible] اکادمی، پنچکولہ

اظہارِ تشکر

تعمیر ہریانہ ——— چنڈی گڑھ
پاسبان ——— چنڈی گڑھ
تحریک ——— دہلی
معلّمِ اردو ——— لکھنؤ
ستارہ ——— لاہور
فکر و فن ——— بٹھنڈہ
اور
آل انڈیا ریڈیو ——— روہتک

حمد اور دعا

ترا ہی سب نام ہے مرا ایک تو ہی تو ہے
میں کچھ نہیں ہوں نہ کوئی ہونے کی آرزو ہے

بدن کی مٹی میں ہے لہو کے خمیر میں ہے
تو چھپ کے بیٹھا ہوا ہمارے ضمیر میں ہے
تری عبادت سے تیرے بندوں میں نیک خو ہے

ترے اشارے پہ ہفت افلاک چل رہے ہیں
ترے ہی پرتو سے لاکھ سورج پگھل رہے ہیں
تجھی سے ہر شے کو عالمِ ہوش میں نمو ہے

ترا تبسم گلوں پہ شبنم اتارتا ہے
تو ہر پرندے کو ہر افق سے پکارتا ہے
ترے کرم سے چمن چمن جشنِ رنگ و بو ہے

تو سب طرف ہے سبھی میں ہے اور کہیں نہیں ہے
ترے ہی دم سے ٹکی ہوئی عرش پر زمیں ہے
ترے تعلق سے آسمانوں کی آبرو ہے

مری سبھی خواہشوں پہ اپنی نگاہ رکھنا!
بھٹک بھی جاؤں تو لوٹ پانے کی راہ رکھنا!
یہی دعا ہے یہی ترے در سے آرزو ہے۔

اِنتظار

وہ سارے خُشک پتّے
جو ہمارے پاؤں کے نیچے کچل کر،
چونک اُٹھتے تھے۔
مجھے اُن کی صدائیں نظم کرنے کے لیے کہہ کر
گجر دم کی گئیں۔ تم،
شام تک موسم زدہ اس باغ میں
واپس نہیں لوٹیں
تو مَیں
دن بھر کی یہ لکھی ہوئی نظمیں،
بھلا کس کو سُناؤں گا؟
کیسے کیسے بتاؤں گا؟
کہ موسم خشک پتّوں کا نہیں
پھولوں کی آمد ہے۔

هماچل کی یاد

ہلکے نیلے رنگ کا
میرا نیا اونی پُل اوور
اور یہ سردی کا موسم

اِن دنوں جب پربتوں پر برف گرتی۔
تو جانے کیوں مجھے
بھیڑوں کے بچّے یاد آتے ہیں
اور میری سوچ ،
اُن بھیڑوں کی ننگی پیٹھ چھُو کر لوٹتی ہے،
جن کے جسموں سے
ابھی تک اُون اُتاری جا رہی ہے۔

وہ چراگاہیں، کہاں ہوں گی ؟
کہ جن میں، دُھند کے نیچے، سبھی کچھ،
سویا سویا جگ رہا ہے
میں بھی اُن بھیڑوں کے بچّوں میں سے
کوئی ایک ہوں،
جانے مجھے کیوں لگ رہا ہے ؟

تانا بانا

شور سناٹے کے بیچوں کو
زمیں پر روندتا ہے
اور کہتا ہے کہ جاؤ!
جس طرح میں اس جگہ لایا گیا ہوں
تم بھی جا کر اپنی کوئی دوسری دنیا بساؤ!"
اور سناٹا
زمیں کا درد سینے سے لگائے
لڑکھڑا کر ڈولتا ہے
کھردرے کمبل سے اک خاموش پیکر بولتا ہے۔
ملتجی آنکھیں۔
کہ جیسے زرد چہرہ پوچھتا ہو،
"شور بھائی!
ہم ترے کہنے پہ اپنا دھاگہ دھاگہ
ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔
بعد میں، لوگوں کو
لفظوں کی ضرورت آ پڑی تو
تم اکیلے کیا کرو گے؟"

لفظ کی بنیاد

چُپ کی یہ کیفیت
صرف الفاظ، جیسے بھی، جو بھی
جہاں سے بھی آئیں، سُنیں!
اپنی آنکھوں کے نزدیک لاکر
انھیں دیکھ پائیں
کہیں سے ذرا چھو سکیں۔

اور تب، ہم سے شاید
زمان و مکاں کے لیے
اک نیا لفظ ایجاد ہو
جو کہ آیندہ سوچوں کی بنیاد ہو۔
اور ممکن ہے
یہ بھی ہماری کوئی گمشدہ یاد ہو۔

وہی اک ربطِ باہم
تم کو مجھ سے، مجھ کو اس سے
اور اُسے سب سے ملاتا ہے
یہ وہ دریا ہے، جو اکثر بیک لمحہ
ہزار اطراف لہراتے ہوئے
بہتا بہاتا ہے
لہٰذا! آج مَیں
اُس ربطِ باہم سا تمھارے سامنے ہوں
اور کہتا ہوں
کہ یوں بیمار آوازوں کے جنگل میں
تمھارا سنگ گانا
کون سے حرفِ نوا کا نام پائے گا
وہ سب جوشِ نمو
جو دشتِ امکاں کی امانت ہے
اگر اپنی طبیعت سے ہٹا
تو بالیقیں، بے کار جائے گا
سنہری حرف کی جاگی ہوئی آہٹ کو پہچانا
تو مَیں تم کو
تمھاری شخصیت کے پار لے جاؤں!

سُنہری حَرف

کبھی خود کو مکمل طور پر خالی اگر محسوس کر پاؤ
تو میں تم کو تمھاری شخصیت کے پار لے جاؤں
تمھاری شخصیت
جس نے تمھیں بیمار آوازوں کے جنگل میں
بھٹکنے کے لیے ہر دور میں مجبور سا پایا
مگر پھر بھی کہیں کچھ تھا
کہ جو تم کو بچا لایا
تمھاری شخصیت، دراصل
مٹی کا کھلونا ہے
جو اپنے آپ میں،
لذت کی لامحدود وسعت کو سموتا ہے
مگر پھر بھی، کہیں اک بوجھ ڈھوتا ہے

کنول، کیچڑ
بنا بردن تک کیفیتیں ہیں ایک پانی کی
مگر تم نے کبھی اس کو بھی جانا ہے؟
کہ جس نے ہر قدم
ڈوب کر چھپ کر باغبانی کی۔

کے سائے میں بلاتا ہے
جو مندر کے شِکھر پر
آرتی کے تھال سا کب سے ہے آویزاں

مجھے لگتا ہے
مَیں بھی آسماں کے سائے میں
اُس ڈوبتے سورج سا تنہا ہوں

تبھی چپکے سے کوئی کان میں آکر یہ کہتا ہے
"اُدھر دیکھو!
اُفق سے تا اُفق
حنائی قدرت پرافشاں ہے
مگر جس موڑ پر تم ہو
وہیں دیوارِ زنداں ہے"

یہاں سے سر اُٹھا کر
آسماں کو دیکھنا اچھا تو لگتا ہے
مگر نیچے، جہاں مَیں ہوں

مگر نیچے جہاں میں ہوں

یہاں سے سر اُٹھا کر
آسماں کو دیکھنا اچھا تو لگتا ہے،
مگر نیچے جہاں میں ہوں
وہاں سے اور نیچے
کتنا کچھ کہرے میں ڈوبا ہے
تمہارے آنسوؤں کی یاد میں
بھیگی ہوا پگڈنڈیوں سے لوٹ کر
مجھ سے لپٹتی ہے
تو میں یکلخت اُس مندر سے آتی
گھنٹیوں کے ناد سنتا ہوں
جہاں، تپ، دھیان، پوجا، سادھنا، آرادھنا
آٹھوں پہر چلتے ہی رہتے ہیں

درختوں کا اک جھنڈ
جو پربت کے ماتھے پہ
تلک سا کھنچا ہو تب
مجھ میں ڈوبتے سورج

اَچّھے لوگ

اکثر دیکھا ہے لوگوں کو
ہم سے بہت بڑے، لیکن
اپنی چھوٹی چھوٹی دُنیا میں پریم سے رہتے
بھوکے پیٹ
مگر اوروں کے لیے ہمیشہ کھاتے پیتے
ان کے مستک ایک اُجالا
دیکھا بھالا
دِل جیسے ہر سمت دوستی
ہاتھ پیار سے بڑھتے آئے
ایسے لوگ نہ ہوں تو یہ دُنیا
ایک جہنم سی ہو جائے۔

ٹوٹے ستارے

چاند میں بیٹھی ہوئی
بڑھیا کا چرخہ چل رہا ہے
دھاگہ دھاگہ روشنی،
جن راستوں سے
آسماں کو جا رہی ہے،
یہ وہی ٹوٹے ستارے جانتے ہیں،
جن کے ہاتھوں کی لکیریں
آج بھی بڑھیا کی جیبوں میں پڑی ہیں
اور جن کی آرزو میں
آسماں سے بھی بڑی ہیں

ہاں مگر معدوم ہیں جو
اپنے ہونے کا غلط مفہوم ہیں جو۔

مگر اب چند خالی کُرسیاں
میزوں کے سینوں سے لگی آرام کرتی ہیں
یہ سب، ہر صبح اُٹھ کر
آنے والے گاہکوں کے نام پر بنتی سنورتی ہیں

مَیں کافی تھک چکا ہوں
اب جو تھوڑی دیر کو بتی چلی جائے
تو مجھ کو نیند آجائے

مَیں آج آنکھوں میں
اُس بچے کی بھولی مسکراہٹ لے کے سوؤں گا
جو کل اس ریستراں میں
اپنی ماں کے ساتھ پہلی بار آیا تھا
مری آواز پر حیرت زدہ ہو کر
جب اس نے ماں سے کچھ پوچھا،
تو اس نے یوں بتایا تھا۔
کہ بیٹے۔ "آدمی کی سانس، روٹی کی مہک
سالن کی خوشبو اور سگریٹ کا دھواں
جب ریستراں میں اک طرح سے قید ہو جائیں
تو یہ پنکھا انھیں اپنے ذریعے کھینچ کر
تازہ ہوا کا راستہ ہموار کرتا ہے۔
یہ پنکھا جانتے ہو؟
آدمی سے پیار کرتا ہے"
یہ سُن کر پھول سے بچے کے چہرے پر

ایگزاسٹ فین

مَیں آوارہ طبیعت تو نہیں
لیکن، ہمیشہ اپنے محور پر
اکیلے گھومتے رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا
یہاں تو یوں بھی چاروں اور
بس مکڑی کے جالے، دُھول مٹّی، اور اندھیرا ہے
یہ چھوٹا سا دریچہ، جس کے اندر
ان سبھی کے ساتھ میں، برسوں سے زندہ ہوں
ہمارا سب کا مشترک بسیرا ہے

اِدھر، باہر میرے مُنہ کی طرف آکاش کھلتا ہے
تو پیچھے، ایک بوڑھا ریسٹوراں
جو نت نئی تہذیب کے سانچے میں ڈھلتا ہے

وہ شاید سو رہا ہے
اور میری آواز سُنا کے یہ بتاری ہے
مری آواز گویا سو رہے اجگر کے مُنہ سے سانس جاری ہے

ابھی کچھ دیر پہلے تک، وہاں سب روشنی
ہر میز پر لوگوں کا جمگھٹ تھا۔

ہچکیاں

ہم نشے میں، گالیاں بکتی ہوا سے لڑ رہے تھے
ہم نشے میں تھے۔ ہوا
جب گالیاں بکتی ہوئی گزری
تو ہم کھل کر ہنسے، ہنستے رہے
لیکن، کبھی تو نے
ہمارے نام سے ہم کو پکارا
ڈوبنے والے کے جیسے
ہاتھ پر لا کر کوئی رکھ دے کنارا۔
اور تب ہم
یک بیک، رونے لگے
روتے رہے، روتے رہے تھے
کیونکہ، جو باقی تھا، سب آنسو تھے
یا آنکھیں، کہ جو بھی
وہ تو تیرے نام کی بس ہچکیاں سی کھا رہا تھا
ہم کہیں باقی نہ تھے
اور تو ہمیں چھوکر، ہوا کے ساتھ
واپس جا رہا تھا۔

نہ جانے کون سے جنموں کی میٹھی مسکراہٹ
جاگ اُٹھی تھی۔
میرے دل میں بھی جس کو دیکھ کر
اک آگ اُٹھی تھی۔

اُسی اک آگ کی لَو میں،
مَیں اپنے آپ کو شاید کبھی پہچان پاؤں گا
مگر اس دُھول، مٹی اور اندھیرے سے
بھلا کب تک نبھاؤں گا؟
مَیں کافی تھک چکا ہُوں
اب جو تھوڑی دیر کو بتی چلی جائے
تو مجھ کو نیند آجائے

مجھے کل صبح
پھر تازہ ہَوا کا راستہ ہموار کرنا ہے
کہ اس بچے کی میٹھی مسکراہٹ کے لیے
اس زندگی سے پیار کرنا ہے۔

داستانِ جہاد

مَیں نے دیکھا ہے
کہ پانی کے مخالف تیرنا
مچھلی کی مجبوری ہے
ورنہ، چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو
بہتے پانی کے سفر میں
عمر کا حاصل نہ ہو کوئی مقام
مرحبا! اے زیست کے دلکش خرام!
مرحبا! اے خواہشِ عمرِ دوام!

بازگشت

تمھاری شدتِ احساس شاہد ہے
کہ جن الفاظ سے تم نے
ہمیں آ کر نوازا ہے
جب ان الفاظ کی موزونیت کا
حق ادا ہوگا
ہمارے عکس ہوں گے
اور تمھارا آئینہ ہوگا۔

حضور آبا نے ہم دونوں کی
ہر ضد کو نوازا اور تراشا ہے

پُرانی ایک مسجد
اور تھوڑے فاصلے پر
ایک چھوٹا سا شوالہ ہے
انھیں سب کی بدولت
آدمی کا بول بالا ہے
یہاں ورنہ جو میلہ، سال میں
دو بار بھرتا ہے
نہ جانے کن بہانہ فریبوں سے گزرتا ہے۔

سبھی کچھ مطمئن سا چل رہا ہے
پھر بھی لگتا ہے
کہیں کچھ لوگ آپس میں جھگڑتے ہیں
کہیں چپ چاپ چلتے
اور کہیں اک دوسرے کے پاؤں پڑتے ہیں
مگر ہم ان سبھی سے
بے نیازانہ گزرتے ہیں۔
ہم اپنی خوش دلی کا
بھیڑ کے چہرے سے اندازہ لگاتے ہیں
کسی بھی آئینے کے سامنے
خود کو جھلک بھر دیکھتے ہیں، کھلکھلاتے ہیں

ہم کھلونے لے ا
ابا حضور کی انگلی

نئے کپڑے پہن کر، آج ہم
اس گاؤں کے میلے میں پہلی بار آئے ہیں
حضور ابا، ہمیں انگلی تھمائے ہیں
وہ پہلے سے ہمیں میلے کے بارے میں
بہت سمجھا کے لائے ہیں۔
ہم ان کے حکم کی تعمیل میں تو ہیں
مگر پھر بھی شرارت، دائیں بائیں
ساتھ چلتی ہے
کبھی میں بھاگتا ہوں
اور کبھی چھوٹی بہن آگے نکلتی ہے۔

بہت سے لوگ ہیں
دنگل، تماشے، خوردنی اشیاء
ہزاروں طرح کی روزانہ استعمال کی چیزیں
مگر اپنے لیے تو
بس یہی دو چار دس
ننھے کھلونوں کا تماشا ہے۔

میں بہت چھوٹا تھا شاید!
کچھ کہیں تھا بھی، کہ بس یونہی سا تھا میں؟
بارش آتی، اور ہم بچے
محلوں سے نکل کر
بھیگتے، کلکاریاں بھرتے
گلی، بازار، چوراہوں کو پیچھے چھوڑتے
بھاگے چلے جاتے
کہ بارش میں، سب اس تالاب میں
مل کر نہائیں
ایک دوجے کو چھوئیں
پانی میں تیریں، چھپ چھپائیں

اب کئی دن بعد آیا ہوں، تو دیکھا ہے
- یہاں سب کس قدر بدلا ہوا ہے
اب یہاں دلدل ہے کیچڑ ہے،
فضا میں گندگی ہے
اُس طرف کا ایک حصّہ
شہر میں جو جانور مرتا ہے
اس کی کھال الگ کرنے کے کام آنے لگا ہے
گدھ، کتوں اور کوّوں کو
بہت بھانے لگا ہے

درمیاں، اب بھی کہیں کچھ ہے
کہ جو کائی کے نیچے سُگبگاتا سا

مٹی کی تہیں

شہر کا تالاب، جانے کب بھرے گا
نہر کا پانی سُنا ہے دے رہے ہیں
نہر کا پانی مگر آنے سے پہلے ہی کہیں یہ
گندگی سے بھر نہ جائے
زندہ رہنے کی بجائے مر نہ جائے

اب یہاں جو بھی دکھائی دے رہا ہے
سب یہاں ایسا نہیں تھا
یہ وہی تالاب ہے، جس میں کبھی
ہر صبح کتنے ہی کنول کھلتے رہے ہیں
دھوپ، جاڑا، آسماں، تازہ ہوا
باہیں پسارے، اس جگہ ملتے رہے ہیں۔

شاعری

میں جب جب
اپنے اندر کی آنکھیں کھول رہا ہوتا ہوں
چاروں اور مجھے بس ایک اُسی کا نام
نظر آتا ہے
نہیں چاہتا کچھ بھی کہنا
لیکن ایک عجب کیفیت
سانس سانس اظہارِ تعلق
یادیں، آنسو، لوگ، زمیں، آکاش، ستارے
جیسے کوئی بحرِ فنا میں
عالم عالم ہاتھ پسارے
اور مدد کے لیے پکارے
اور وہ سب جو، تنہا پیچھے چھوٹ چکا ہوتا ہے
یا آگے آنے والا ہوتا ہے
جانے کیسے ؟ سناٹے کی دیواروں کو توڑ کے
اپنے آپ زباں میں ڈھل جاتا ہے
دُور اندھیرے کی گھاٹی میں
ایک دیا سا جل جاتا ہے۔

یونہی آبا کی انگلی تھام کر
پُرانے موسموں کی یاد کو تھامے ہوئے ہے۔

کوئی کہتا ہے، اسے مرگھٹ سے جوڑا جا رہا ہے۔
اور کوئی گھاٹ کے بارے میں کہتا ہے
کہ توڑا جا رہا ہے
کچھ کا کہنا ہے، کہ جب چاروں طرف
یہ گندگی سے بھر اٹھے تو،
ایک دو مٹی کی ہلکی سی تہیں دے کر
اسے اک خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیں
یا اگر سرکار کو منظور ہو تو،
اس جگہ کو بیچ ڈالیں
تاکہ، لوگ اپنے لیے
اس شہر میں کچھ گھر بنائیں
شہر کا تالاب جانے کب بھرے گا؟

جُرعہ جُرعہ موت

تم جو کہتے ہو کہ طوفاں تھم چکا ہے
عین طوفاں میں گھرے انساں کا
ایسا سوچنا ہمت ہے، لیکن
تم جو ساحل پر کھڑے ہو
دُور ہی سے ڈوبتی کشتی کو دیکھے جا رہے ہو
تم تو اُس کے ناخدا تھے
تم یہاں ساحل پہ کیسے آ گئے ہو؟
اس پہ کہتے ہو کہ طوفاں تھم چکا ہے۔
اور اگر یہ سب واقعی یوں ہے
تو اتنا بھی سمجھ لو!
تم یہاں ساحل پہ ہو کر بھی
اسی کشتی کے اندر ہی رہے ہو
ڈوبنے والے کی ہر آواز کا دکھ
جرعہ جرعہ پی رہے ہو۔

خوف کا نوحہ

لفظ کے ناخن جب اُگ آئے
تو ہم نے
میری آنکھوں میں اُتر کر
خوف کے پنجے گڑوائے
بات یوں روزِ ازل کی ہے، مگر شاید
ابھی میں سو رہا تھا
مجھ میں جو تازہ لہو تھا
اس نے اپنے ناخنوں میں بھر لیا تھا

اور اب میں
جاگنے پر چاہے جتنا چھٹپٹاؤں
آنکھ پھراؤں
کہ اپنی روح کا پردہ اُدھیڑ دوں
دھجیاں الفاظ میں تبدیل ہو کر بھی رہیں گی
ہاں مگر امکانِ جاں کے راستے پر
خوف کا نوحہ سدا لکھتی رہیں گی۔

یوگی

جو سوچتا ہے، وہ بھوگتا ہے
جو سوچتا ہی نہیں اُسے بھوگنا بھی کیا ہے؟

مَیں سوچتا ہوں۔
مگر مَیں جو سوچتا ہوں وہ بھوگتا نہیں ہوں
کہ میری ہر سوچ
دو طرف سے دسوں دشاؤں مُڑی ہوئی ہے
"ہیں" سے "ہے" تک جُڑی ہوئی ہے۔

امیر غریب

جنھیں سب کچھ ملا ہوتا ہے
وہ سب کے تعلق سے ——— جہاں جائیں
خُدا کے نام کا احساس رکھتے ہیں
مگر اُن میں کچھ ایسے ہیں
جنھیں سب کچھ ملا ہو کر بھی، کچھ حاصل نہیں ہوتا
یہ لوگ اپنے تجسّم کا
خدا سے بھی زیادہ پاس رکھتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں شاید
کہ جن کی مسندیں اکثر
شہنشاہی خیالوں سے بنی ہو کر بھی
اندر سے ہمیشہ راکھ ہوتی ہیں
کہ جن کے دائیں بائیں سے
خُدا کا نام
اک بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی صورت
سامنے والے کی بس گردن میں دھنستا ہے

اَمیر غریب

جنھیں سب کچھ ملا ہوتا ہے
وہ سب کے تعلق سے —— جہاں جائیں
خُدا کے نام کا احساس رکھتے ہیں
مگر اُن میں کچھ ایسے ہیں
جنھیں سب کچھ ملا ہو کر بھی، کچھ حاصل نہیں ہوتا
یہ لوگ اپنے جہنم کا
خدا سے بھی زیادہ پاس رکھتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں شاید
کہ جن کی مسندیں اکثر
شہنشاہی خیالوں سے بنی ہو کر بھی
اندر سے ہمیشہ راکھ ہوتی ہیں
کہ جن کے دائیں بائیں سے
خُدا کا نام
اک بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی صورت
سامنے والے کی بس گردن میں دھنستا ہے

اَمیر غَریب

جنھیں سب کچھ ملا ہوتا ہے
وہ سب کے تعلق سے ——— جہاں جائیں
خُدا کے نام کا احساس رکھتے ہیں
مگر اُن میں کچھ ایسے ہیں
جنھیں سب کچھ ملا ہو کر بھی، کچھ حاصل نہیں ہوتا
یہ لوگ اپنے جہنم کا
خدا سے بھی زیادہ پاس رکھتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں شاید
کہ جن کی مسندیں اکثر
شہنشاہی خیالوں سے بنی ہو کر بھی
اندر سے ہمیشہ راکھ ہوتی ہیں
کہ جن کے دائیں بائیں سے
خُدا کا نام
اک بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی صورت
سامنے والے کی بس گردن میں دھنستا ہے

تینتیسویں بیل

سینگ دایاں ہو کہ بایاں
بیل کو تو، جس کسی صورت
زمیں کو سر اونچے تھامنا ہے
کچھ کبھی گردن ہلانے کی اگر فرصت ملی بھی
تو زمیں پر زلزلہ، سیلاب، طوفاں
کیا نہ آیا
اور پھر کچھ آسمانی دیوتاؤں نے
اسے آکر ڈرایا
"یوں نہ ہونا! یوں نہ کرنا!
اپنی ہر حرکت سے ڈرنا!
ورنہ اس دھرتی کے باشندوں کی رُوحیں
چیخ کر تجھ سے لپٹ جائیں گی
جن کی بد دعا سے ——— تا ابد
تجھ کو جہنم کی سُلگتی آگ میں جلنا پڑے"

تب سے وہ اک سینگ پر
دم بخود سیدھا کھڑا ہے
بیل گویا دُوں نہیں تو یوں جہنم میں

لاانتہا

زندگی میں جو بھی کچھ ہے
یا تو وہ تیرے تعلق سے بنا ہے
یا فقط تیرے لیے ہے
اور جو کچھ بھی نہیں ہے
وہ تیرا اور اس کا تو
ہر دم احاطہ سا کیے ہے
کیونکہ، تو
اس کچھ نہیں ہی کی وساطت سے
ہمیشہ ہر کہیں لاانتہا ہے
اور ایسے میں کوئی مجھ سا
بھلا کیسے سمجھ پائے
کہ تو کیسا خدا ہے۔

ہرگز یقیں کامل نہ لاؤ گے

اگرچہ لاتعلق ہوں
مگر مَیں جو کہ خود ان کی زباں میں
بات کرتا ہوں
کہیں اُن سے زیادہ
تم پہ مرتا ہوں
مَیں تم سے چاہتا ہُوں
تم انھیں میری طرح دیکھو!
کہ جو مجھ کو ہمیشہ کچھ نہیں کہتے ہوئے
میرے علاوہ اور کچھ ہونے کی
نیت سے پریشاں ہیں۔
مگر کم جانتے ہیں
خود انھیں کی بات ہی
ان کے لیے دیوارِ زنداں ہے۔

دیوارِ زنداں

میرے بارے میں تم لوگوں سے پوچھو گے
تو وہ تم سے کہیں گے
"ہاں! سُنا کرتے تو تھے کچھ تھا،
مگر ہم نے تو اس کو
ہر کہیں مفقود پایا ہے۔
کبھی دیکھا بھی ہے یا آزمایا ہے۔
تو وہ
کچھ بھی نہیں ہوتے ہوئے بھی ہاتھ آیا ہے۔
ہو، اب وہ کہیں کچھ بھی نہیں
تم نے ہزاروں بار ثابت کر دکھایا ہے"!

تم ان کی بات سُن کر چونک جاؤ گے
تو میری ذات پہ

اب ایسے میں
اگر تم سے کوئی پوچھے!
"سوا اک لذتِ دردِ نہاں تم کس کے واقف ہو؟"
تو شاید رو پڑو —— یا
اندر اندر ٹوٹ جاؤ گے
مگر اپنا کوئی آنسو تو دامن تک نہ لاؤ گے
کہ میں جو ہر کہیں
موجود د ناموجود رہتا ہوں۔
فقط ایسے ہی عالم کے لیے
ہر آنکھ سے مفقود رہتا ہوں
تمھارے آنسوؤں کو
درمیاں سے جذب کر کے جا چکا ہوں گا
تمھارے آئینے کو
صاف رکھنے کی غرض سے
مجھ کو جو کہنا تھا سب سمجھا چکا ہوں گا۔

شہر، آئینہ، تم اور میں

تمھیں اپنے علاوہ شہر میں
جب کوئی شے اچھی نہیں لگتی
تمھیں جب کوئی شے اچھی نہیں لگتی
تو بس تم ہے
تمھارے آئینے کی بات کہتا ہوں
کہ ہر مو خود اس کے پاس رہتا ہوں

مگر تم ہو کہ اپنے آئینے کو بھی،
اُٹھا کر، پھیر کے چہرے سے
اکثر توڑ دیتے ہو
مرے آئینہ تو بے معنی بنا کر توڑ دیتے ہو

تنبیہ

تو نہ چاہے بھی تو سب اُس کو خبر ہے
آدمی کا زندہ رہنا
اس کی نظروں میں ہمیشہ معتبر ہے
پھر تجھے کس بات کا دنیا میں ڈر ہے
کاش : لیکن
اب ترے ہاتھوں نہ ہو سرزد
کبھی کوئی گناہ
بعد میں جا کر کہیں
تجھ کو جو کر ڈالے تباہ۔

نقشِ دوام

مَیں ترے نقشِ قدم کو
جب کبھی آئینہ صورت دیکھتا ہوں
راستہ معبد نظر آتا ہے مجھ کو
بند پلکوں پر لرزتے آنسوؤں سے نام پاکر
وقت تب دُنیا میں دہراتا ہے مجھ کو
اور مَیں تیرے دید کی دولت سے مالامال
خود اس کو لُٹانے،
پوری دُنیا میں، اکیلا
بے تحاشا بھاگتا ہوں
مَیں ترا نقشِ قدم بن کر
زمیں پر جاگتا ہوں۔

اِمکانِ جاں

بہت گہرے اُتر آئے ہو
اس اندھی گپھا میں
اور اب واپس بھی جانا ہے
مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی
اس آگ کا کوئی ٹھکانہ ہے

تم! اپنے آپ کو!
اپنے کسی نقشِ قدم کے
خوبصورت لاحد احساس تک لاؤ!
نگاہوں کو بچاؤ!
آگ سے باہر نکل جاؤ!

ریل مسافت میں

آپ جو کچھ جانتے ہیں
سامنے والا بھی ممکن ہے
وہ سب کچھ یا کر اُس سے بھی زیادہ جانتا ہو
اور اس نے
آپ کے لہجے سے، لفظوں سے،
انا کے آئینے میں،
آپ کی پوری کی پوری شخصیت کو
پڑھ لیا ہو
اور چپ بیٹھا ہُوا ہو۔

امکانِ جاں

بہت گہرے اُتر آئے ہو
اس آدمی کی گپھا میں
اور اب واپس بھی جانا ہے
مگر چاروں طرف پھیلی ہوئی
اس آگ کا کوئی ٹھکانہ ہے

تم اپنے آپ کو،
اپنے کسی نقشِ قدم کے
خوبصورت لاصدا احساس تک لاؤ!
نگاہوں کو بچاؤ!
آگ سے باہر نکل جاؤ!

ریل مسافت میں

آپ جو کچھ جانتے ہیں
سامنے والا بھی ممکن ہے
وہ سب کچھ پاکر اس سے بھی زیادہ جانتا ہو
اور اس نے
آپ کے لہجے سے، لفظوں سے،
انا کے آئینے میں،
آپ کی پوری کی پوری شخصیت کو
پڑھ لیا ہو
اور چپ بیٹھا ہُوا ہو۔

اور تب دونوں جہاں کے پھول
سانسوں میں کھلیں گے

خواب اندر خواب کی سی کیفیت میں،
بس کہ اک ناگفتہ بہ احساس ہی تو معتبر ہے
زندگی کی اس شکست و ریخت سے ورنہ
کسے حاصل مفر ہے؟

آرزو کی بستیوں میں
خواہشوں کی سب تہوں کو
دور تک کھولا ہے ہم نے
منزلِ حق میں خودی کو جان پر تولا ہے ہم نے
اور اگر سچ پوچھیے تو
اپنے ہونے یا نہ ہونے کا ہمیں
اب غم نہیں ہے۔
جانتے ہیں، وقت کے ہاتھوں ہمیشہ
کچھ بھی مستحکم نہیں ہے۔

خیالِ رفتگاں

وہ جو مستحکم نہیں ہیں
بہتے پانی پر لکیروں کی طرح آتا ہے جن کا
دھوپ میں بادل کے ٹکڑوں سا بکھر جاتا ہے جن کا
عکس جن کے کچھ بھی چھو جانے سے
بس میلے ہوئے ہیں
رنگ جن کے آج بھی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں
خوشبوئیں جن کے تعاقب میں سدا
باہیں پسارے گھومتی ہیں
موسموں کی دیویاں جن کے پروں کو چومتی ہیں
تم انھیں خوابوں کی منزل میں کہیں دیکھو؟
تو کہنا!
ایک دن اب ہم
خود اُن سے آملیں گے۔

نہ کوئی چیز گری تھی، جب گرنے
نیچے اوپر، اِدھر اُدھر سے
لوگ بھی کم کم بہتے تھے
کوئی فرق نہیں تھا ورنہ یہ تیرے،
ویسے میں دیکھا دیکھی کو ڈرتا تھا
دریا کے چھونے سے پہلے ہی نے
صاف سنی تھیں
تیری آوازیں
اک کلکاری ——— ایک چیخ اور ایک شعبادہ۔

پانی کی گہرائی کو کیا اندازہ تھا؟
تہ جیسے ہی نیچے آیا!
میں نے پایا!
دور، دور تک تل کا بھی گمان نہیں ہے
پاؤں ٹکانے کو کوئی پتھر
کوئی چٹان نہیں ہے۔

تبھی ڈوبنے کا خیال جب دل میں آیا!
میں گھبرایا
(دم گھٹتا ہے!)
سانس سانس میں اوپر کو بڑھتا آتا، جیوں
سطح سمندر کو بھی لیکن
ساتھ ساتھ چڑھتا پاتا ہوں
جانے اس پانی سے باہر کب آؤں گا؟
اور اس عالیشان عمارت میں

خود پسند کچھوا

جنوں کی تپتی ہوئی اس دوپہر میں
جانے کس نے ؟
مجھ کو میری پیٹھ پر الٹا دیا ہے
یہ زمیں بستر،

پھر کب واپس جاؤں گا؟
خوف یہی ہے،
میرے ساتھ سمندر بھی
یونہی ویرانستا آیا تو
اس کھاری کا کیا ہوگا؟

کاش! مَیں اِن مچھلیوں سے
صرف سیدھے تیرنے کے سوا
کچھ سیکھ پاتا!
جون کی تپتی ہوئی اس دوپہر میں
اس جہاں سے یوں نہ جاتا!

کہ اک جلتی چتا ہے !
سامنے گز بھر کی دُوری پر کھڑا تالاب
مجھ پر ہنس رہا ہے
گرم لُو کا ذرہ ذرہ
جسم و جاں کو ڈس رہا ہے

مچھلیاں روشن خیالوں سی
مرے پیراہنِ احساس کو چھُو کر گزرتی گئیں
مگر میں تو حصارِ ذات سے باہر نہ آیا
اور نہ ان کو اپنے اندر ہی بلایا

میں کہ سردی کے دنوں میں
دھوپ سے اپنی انا کا ساتھ پانے کے لیے
ان مچھلیوں سے دُور بھاگا
ایک ہی پانی میں رہ کر
آج تک ہرگز نہ ان کے ساتھ سویا
اور نہ جاگا
اور اب میں چاہے جتنا چھٹپٹاؤں
دکھ کے اشکوں میں نہاؤں
خود بخود ڈوب تو
جب کہ نہ آئے گا یہاں تک
یہ زمین و آسماں
مجھ کو بچا لیں گے کہاں تک ؟

ستاتے وری دنیا پر پھیلا کر بیٹھے
اپنے سر کے پیچھے ایک صف بنا کے بیٹھے،

یہاں وہاں سب دیکھا ہے
اسے دیکھ کر یہ سب کتنے ہنستے ہیں
اور بستیاں تن جاتی ہیں
جی کرتا ہے!
زور زور سے چیخ جاؤں:
سب کو اپنے پاس بلاؤں!
اور اگر کچھ لوگ مری آواز پہ آئیں،
تو سب مل کر
اس پہاڑ کے اندر تک بارود بچھائیں
اور اسے پل بھر میں اڑائیں

اور کبھی، میری باہیں لمبی ہو کر،
اس پہاڑ کی چوٹی کو
اوپر تک جا کر چھو آتی ہیں
کتنے بڑے بڑے کانٹوں سے
اس کی پیٹھ لدی ہوتی ہے
اور مجھے دُکھ کے پہاڑ کا دُکھ آتا ہے!
لہولہان انگلیوں سے جو
اس کی کانٹے دار پیٹھ کو سہلاتا ہے!
اور ہتھیلیوں میں میری یکلخت کہیں سے
خوشبو سا کچھ بھر جاتا ہے۔

سِسی فَس کے بَعد

رات کے گھپ سناٹے میں
اکثر ذہن اچٹ جاتا ہے
دیو ہوا وہ بوجھ ہے جس کے نیچے میں دب کر
بے سانس ابھی ہوتا ہوں

تَرکِ وَفا

مجھے تو کوئی ایسی جلدی نہیں ہے
مگر تم جو جاؤ؟
تو مجھ کو بس اپنا پتہ لکھ کے دے دو!
کہ شاید نگاہوں کے ان راستوں پر،
جہاں ہم کھڑے ہیں
کبھی پھر ملیں ہم!
مجھے تو کوئی ایسی جلدی نہیں ہے
جو جانا ہی چاہو
تو مجھ کو بس اپنا پتہ لکھ کے دے دو!

جو میری دونوں آنکھوں کو
گنگا جمنا کر جاتا ہے
دُکھ کا وہ پہاڑ چُپ چاپ دُھواں ہو کر تب
دُور اندھیرے کے
اُس پار اُتر جاتا ہے۔

گھنے جنگل کے ہر اک خوبصورت
جانور کو، بھوت سا بن کر ڈراتا ہے
مجھے آواز سے اپنی بلاتا ہے .
میں اس کا سامنا کیسے کروں ؟
کوئی تو بتائے ؟
کہ سورج کے سبھی رنگوں میں
اُس کا غضب
مجھ کو سمجھائے
کہ آخر میں نہ کوئی پنچھی ہوں
ہرگز، نہ پتہ ہوں
سنہری آنکھ کے لمبے سفر کا
ایک ننھا سا رستہ ہوں -

مور

مرے دل میں، کسی اُمید کی
ہلکی سی،
کوئی بھی کرن
جب جگمگاتی ہے۔
تو میں خود کو پر افشاں جان لیتا ہوں
گھنے جنگل کے سینے میں نہاں
تازہ درخشاں کونپلوں کے رُوپ میں
دُھلتی ہُوئی اک آگ کو
پہچان لیتا ہوں
مگر

یہ رات کالی رُت
تو کالے پیڑ کی
نیچی کسی شاخ پہ بیٹھا

گھنے جنگل کے ہر اک خوبصورت
جانور کو، بھوت سا بن کر ڈراتا ہے
مجھے آواز سے اپنی لبھاتا ہے۔
میں اس کا سامنا کیسے کروں؟
کوئی تو بتلائے؟
کہ سورج کے سبھی رنگوں میں
آپس کا تعصب
مجھ کو سمجھائے
کہ آخر میں نہ کوئی پھول ہوں
ہرگز، نہ پتّہ ہوں
سنہری آنکھ کے لمبے سفر کا
ایک معمولی سا رستہ ہوں۔

مور

مرے دل میں، کسی اُمید کی
ہلکی سی،
کوئی بھی کرن
جب جگمگاتی ہے۔
تو میں خود کو ضیا فشاں جان لیتا ہوں
مجھے جنگل کے سینے میں نہاں
تازہ درختاں کونپلوں کے روپ میں
ڈھلتی ہوئی اک آگ کو
پہچان لیتا ہوں
مگر

جب رات کا ڈر
[illegible]
[illegible]

مری پہچان غائب ہے
میں بتاؤں؟
لوٹ جاؤں؟
لوٹنا میرا مقدر ہے۔
مگر اے کاش!
بس اک بار وہ:
آنکھیں اٹھا کر دیکھ لے
اور صرف اتنا پوچھ لے مجھ سے
"تم آئے ہو؟"
کہ پچھلی مرتبہ اس نے کہا تھا
"تم ضرور آنا!"

میں آیا

بچھڑتے وقت
پچھلی مرتبہ اس نے کہا تھا
"تم ضرور آنا!"
کہا تھا "جو وقت ملتے ہی ضرور آنا!"
میں آیا
کس طرح آیا؟
نہ جانے کس طرح آیا؟
مگر ـــــ اب
اس کی آنکھوں سے

ماں! ہمارا خون پانی ہو چلا ہے !
اب دوزخ، سربسر، جیسے کہ
سب جیون کہانی ہو چلا ہے! -

اب صدا اندر سے آتی ہے
کہ یہ دُنیا ہمیں بہم
بہت گہرے اندھیروں میں
کہیں دفنا رہی ہے
دوسری آکر یہ کہتی ہے
کہ مٹی میں یہی جوشِ نمو کی پیاس تو
سورج کو بھی روزِ ازل سے
آج تک دہکا رہی ہے
ماں! ہمارا خون پانی ہو چلا ہے !

ماں! بھلا یہ کیا ضروری ہے کہ
تیری کوکھ سے پتوں کی صورت
پھوٹ کر ہم پھول بن جائیں ؟
ضروری ہے ؟
کہ ہم پیڑوں پہ لٹکے گھونسلوں میں
ٹانک دیں لاکر
کھلے آکاش کی ساری دشائیں ؟
کیوں ضروری ہے ؟
کہ جب بادل بہت گہرا گھرا ہو
ایک اک سورج کرن کو
پنجے میں اپنی دبا کر

کیوں؟

ماں!
یہ کیسی زندگی ہے؟
ماں! ہمیں اکثر یہ لگتا ہے
کہ اب تیرے سوا، جیسے
کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔
ریڑھ کی ہڈی سے لے کر
گردنوں تک
صاف جیسے گردنوں تک،
خون میں بھیگے ہوئے رومال ہیں
یا نُچی آنکھیں
ورنہ اب شاید کہیں کچھ بھی نہیں ہے

شبِ غم

میرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ کھاؤں
صرف سو جاؤں!
یونہی چپ چاپ سو جاؤں!
کہ جیسے

ناچتے جائیں، ہم اپنی ہی صدا کے
دَرد کی اندھی گپھائیں؟

سچ بتانا ماں!
ہمارا پیٹ تیرے پیٹ سے
کیسے جُڑا ہے؟
کیوں جُڑا ہے؟
کیوں؟...

شبِ غم

مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ کھاؤں
صرف سو جاؤں!
یونہی چپ چاپ سو جاؤں!
کہ جیسے

ناپتے جائیں، ہم اپنی ہی صدا کے
درد کی اندھی گپھائیں؟

سچ بتانا ماں!
ہمارا پیٹ تیرے پیٹ سے
کیسے جُڑا ہے؟
کیوں جُڑا ہے؟
کیوں؟ . . .

جہاں جو خواب ڈھلتا ہو
مجسم خواب صورت ہو
مگر
تنہائی کے اس دشت کی
یہ لپلپاتی آگ
جو احساس کے ہر پھول کو
چپ چاپ ڈستی ہے
مجھے گھیرے کھڑی ہے
اور سورج کی سہانی دھوپ کو
پتوں پہ پھیلی اوس میں ڈھل کر
پپیہے سی ترستی ہے
مرا جی چاہا ۰۰۰۰۰
۰۰۰۰۰۰۰۰۰
مرا جی چاہتا ہے
آج میں کچھ بھی نہ دیکھوں
صرف سو جاؤں!
یونہی چپ چاپ
اف! دیکھو! سنو! تم کون ہو؟
جو اس طرح چپکے سے آئے ہو؟
کہ میری نیند اچٹ کر رہ گئی ہے
اور، میری آنکھیں!
نہ ہنستی ہیں نہ روتی ہیں
فقط دن رات جلتی ہیں

بھوک کے مارے ہوئے، کتنے ہی بچے
آئے دن اس شہر کی سڑکوں پہ سوتے ہیں

نہ جانے کیوں، مجھے اکثر یہ لگتا ہے
کہ میں اک دُودھ مُنہا بچہ ہوں، جس کی ماں
یہیں شاید کسی فٹ پاتھ پر
اپنا سبھی کچھ بیچ آئی ہے
مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ کھاؤں
صرف سو جاؤں!
مگر اس شہر کی دیوار،
جو تلوار کی صورت مری گردن پہ لٹکی ہے
اُسے توڑے بنا
فٹ پاتھ کی یہ زندگی، کیسے بسر ہوگی؟
مری مٹھی میں
یہ دن رات کی پھیلی ہوئی چادر
کہیں آ کر تو آخر مختصر ہوگی!
مرا جی چا ......
....

مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ پہنوں
صرف ننگے سے ننگا ہو جاؤں!
ننگا ہو جاؤں، کہیں ایسی جگہ

آدمی کے ساتھ چلتے ہیں
مرے اندر کسی بدنام خواہش کی طرح
دن رات پلتے ہیں
مگر ——— میں جانتا ہوں!
خواہشوں کا یہ انوکھا جال
جو میرا بچھونا ہے
مجھے اس کے سوا بھی تو کہیں کچھ اور ہونا ہے!
مرا جی چاہتا ہے،
آج ... میں ......!

نہ جانے کیوں مجھے اکثر یہ لگتا ہے
مری آنکھوں میں اب آنسو نہیں
آکاش کے دھندلے ستارے ہیں

جو میری روح میں
ٹوٹے ہوئے کچھ کانچ کے ٹکڑاوں کی صورت
جھلملاتے ہیں
بدن میں ریشمی دھاگوں سے تن کر
اینٹھتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، سرسراتے ہیں
کسی خوں میں ہیولے سا،
مجھے میرے لہو کی دھار پر نہ نگا نچاتے ہیں
مرا جی چا . . . . .

. . . .

مرا جی چاہتا ہے!
آج میں کچھ بھی نہ لکھوں۔
صرف سو جاؤں!
یونہی چپ چاپ، جیسے
انگلیوں سے اب قلم کا ساتھ چھوٹا ہو
کہ جیسے اک مجرد لفظ کو
چھونے کی کوشش میں
کہیں اک ناتواں سا ہاتھ ٹوٹا ہو۔
نہ جانے کیوں مجھے اکثر یہ لگتا ہے
کہ جیسے وہ مجرد لفظ اور
وہ ناتواں سا ہاتھ
جو روزِ ازل سے

آدمی کے ساتھ چلتے ہیں
میرے اندر کسی بنام خواہش کی طرح
دن رات پلتے ہیں
مگر ــــــ میں جانتا ہوں !
خواہشوں کا یہ انوکھا جال
تو میرا بچھونا ہے
مجھے اس کے سوا بھی تو کہیں کچھ اور ہونا ہے !
میرا جی چاہتا ہے،
آج ... میں ......!

سَرُدرَوُ

سردرد،
پچھلے کئی دن سے
شمالی ہند کو گھیرے ہوئے ہے
سوچتا ہوں
وہ شمالی ہند ہو یا خطۂ سطان کا
چھوٹا سا اک تنہا جزیرہ
ایک دن یہ سردرد
پوری زمیں کو گھیرے گی

اور ہم سب
دھوپ تپے پھیلے ہوئے تپتے سر اُٹھائے۔
برف پگھلنے کی دعائیں مانگ کر
بے بخشش ہوں گے۔

مَیں ابھی کچھ دیر پہلے
شہر کی سڑکوں پہ آوارہ بھٹکتا پھر رہا تھا۔
مَیں نے دیکھا
نصف شب کا چاند
جانے کس جگہ جا کر چھپا ہے؟
مستقبل کا شہر اندھا ہو گیا ہے۔
شہر کا ماحول، جنگل کی فضا، سب
ایک بھوری دُھند میں لپٹے ہوئے ہیں
آسماں حدِّ نظر تک منجمد ہے
سایا سایا دم بخود ہے
صرف کچھ نقّال چیخیں ہیں
جو رہ رہ کر فضا میں گونجتی ہیں
کھوکھلی سمتیں جنہیں سُن کر
ستاروں کو سیاہی بانٹتی ہیں
حَبس برفانی علاقوں کا
نسّوں میں اُتر کر رینگتا ہے
تم ہوا کا ذائقہ چکھنے سے پہلے
اپنے اندر خون کی مقدار جانچو!
نبض کی رفتار تو بے شک وہی ہے
دل دھڑکنے کا مگر انداز یا رو گے
کہ پہلے سے جُدا ہے

رات اب بھی دو پہر باقی ہے لیکن
بندوقوں کے سبب آتش دان خالی ہو چکے ہیں

سَرْدَرَو

سردرو،
پچھلے کئی دن سے
شمالی ہند کو گھیرے ہوئے ہے
سوچتا ہوں
وہ شمالی ہند ہو یا خطۂ ستان کا
چھوٹا سا اک تنہا جزیرہ
ایک دن یہ سردرو
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جو ایک بے ہنگم خلا ہے
کیا کوئی بھی ہاتھ اُسے پُر کر سکے گا؟

سر درد کا
ریڑھ کی ہڈی سے جب
سیدھا سا رشتہ ہو
تو پھر ہذیان گوئی کیا کرے گی؟

اب وہاں مردہ ہوا کا خول ہے۔
یا آگ کا بے جان پیکر

سرد بستر

میرے ہر موئے بدن میں
زہر سا بونے لگا ہے
جسم جیسے ریشہ ریشہ ٹوٹ جانے پر تُلا ہے
ذہن میں اُڑتی ہوئی چنگاریوں کا شور سا ہے
اندر! اندر!
ایک لامحدود گہرائی کی خندق
مجھ پہ مُنہ بائے کھڑی ہے!
بات جو میں نے اُٹھائی تھی
وہ مجھ سے بھی بڑی ہے؟

میرے بائیں پیر کا سب سے بڑا ناخن
کسی ٹھوکر سے کالا پڑ گیا ہے
میری دائیں آنکھ سے
زہ زہ کے پانی برس رہا ہے
ناخنوں میں ریت کے ذرے چمکتے ہیں
مگر پانی کہاں ہے؟
سوچتا ہوں
کیا مقدس کتابوں کے اوراق اُلٹنے سے
نصیبوں کا منشا بدل جائے گا؟
نجوم و نجوم کے درمیاں

ہم ابھی شاید!
الف بے پے ہی لکھنا سیکھ پائے تھے
کہ جب اسکول میں سیلاب آیا
گاؤں کے کچے مکانوں سے نکل کر
کوئی باہر آ نہ پایا

میں، محمد، رام، گوتم اور نانک
ہم سبھی کو اک نئی ترکیب سوجھی
پیٹھ پر بستے اٹھائے
تختیاں سینوں سے چپکائے
گلی کے موڑ تک ہم تیر آئے
دم بدم اسکول کی گرتی ہوئی چھت
ہم کو واپس لوٹ آنے کے اشارے
کر رہی تھی
ہم نے پل بھر کے لیے سوچا
مگر تب دفعتاً
آکاش سناٹے میں گونجا!
چوندھیاتی آنکھ سے ہم
ایک دوجے کے لیے لپکے ——
مگر سب کھو چکا تھا
ہر کوئی چپ چاپ اکیلا ہو چکا تھا

میں، محمد، رام، گوتم اور نانک
ہوش آنے پر سبھی نے

الِفؔ بؔ پؔ

نیلگوں پتھر سلیٹوں پر
غزالوں کی طرح آنکھیں لگائے
ہم لکیریں کھینچتے
آپس میں کچھ تیار بے تھے
ماحصل، کن کن لکیروں کا،
کہاں کس حرف میں کتنا گھنا ہے
بس یہی چنچل پرندوں کی ادا میں
بول کر سمجھا رہے تھے
اُس گھڑی، استاد صاحب پر
غزل اُتری ہوئی تھی
آسماں پر بادلوں کے جھنڈ فوٹے کھا رہے تھے۔

—

تاگڑی، تعویذ، قشقہ، کیس، پگڑی
یا جنیو کو ہی سُنّت مانتے ہیں

زندگی گزری، مگر لگتا ہے جیسے
آج بھی ہم اپنی اپنی سُنّتوں کو
بیٹھے پرستوں کی صورت ڈھو رہے ہیں
آج بھی اسکول کی گرتی ہوئی چھت سے
اشارے ہو رہے ہیں۔

گاؤں کی مٹی کو ماتھے سے لگایا
اور الف ب پ کے لفظوں کو
دلوں کے ساتھ سینوں میں سجا کر
اپنی اپنی ذات کا پرچم اُٹھایا

گو کہ اس کے بعد ہم
اپنی وراثت کھو چکے تھے
ہم جماعت ساتھیوں کے نام لیکن
دوسری جگہوں پہ روشن ہو چکے تھے ۔

درحقیقت !
اُس الف ب پ سے آگے
آج تک جو کچھ کہیں لکھا، پڑھا ہم نے
کہ سیکھا یا کہا
سب کھیل سا تھا۔
آئینہ ادراک کے چہرے ہی سے
بے میل سا تھا

میں، محمد، رام، گوتم اور نانک
ہم کہیں بھی ہوں ۔
مگر ادھورے ہم سب،
کس قدر گویا ہیں،
یہ تو ہمیں پہچانتے ہیں
لوگ تو کمتر، ہمارے،

نقشِ فریادی

میرا اندھا سہوور اور میں

دیکھو! دیکھو!
پھر وہ میرے سامنے ہے
پھر میرے اندر کہیں تیزاب سا گھلنے لگا ہے
پھر میں اپنے ہی لہو کی دھار پر بہنے لگا ہوں
اور اس کی ہر اذیت،
بھیشم کی صورت کسی کالے مہابھارت کے
تیروں پر پڑا سہنے لگا ہوں۔

میں کہ جو ہندوستاں ہوں
میں کہ جو ہندوستاں کی خاک سے اُبھرا ہوا
اک نامکمل نقش سا ہوں
میں کہ جو شاید کہیں کچھ بھی نہیں ہوں۔

وہ جو ہم سے دُور ہے تو
یہ جو اندر سے ہمیں تقسیم کرنے میں لگا ہے،
کون ہے یہ؟
اور اگر یہ وہ نہیں تو وہ کہاں ہے؟
جس جگہ ہم بیٹھ کر
اپنے حصارِ ذات سے اُلجھے ہوئے ہیں،
یہ کوئی گنبد ہے، روزن ہے،
کہ روشن آسماں ہے
یا فقط خواہش زدہ مٹی کا
اک خالی مکاں ہے؟

یا کہیں ایسا نہ ہو وہ آچکا ہو؟
اور ہمیں اپنی طلسمی تیغ سے
تقسیم کرکے جاچکا ہو!

نقشِ فریادی

میرا اندھا سبور

اور میں

وہ جو ہم سے دُور ہے ہو
یہ جو اندر سے ہمیں تقسیم کرنے میں لگا ہے،

کون ہے یہ؟
اور اگر یہ وہ نہیں تو وہ کہاں ہے؟
جس جگہ ہم بیٹھ کر
اپنے حصارِ ذات سے اُلجھے ہوئے ہیں،
یہ کوئی گنبد ہے، روزن ہے،
کہ روشن آسماں ہے
یا فقط خواہش زدہ مٹی کا
اک خالی مکاں ہے؟

یا کہیں ایسا نہ ہو وہ آچکا ہو؟
اور ہمیں اپنی طلسمی تیغ سے
تقسیم کر کے جا چکا ہو!

دانتوں کو اپنے کٹکٹا کر بھینچتا ہے،
اس کی ہر اک سانس میں
سوا اژدہے پھنکارتے ہیں
سُوکھ جاتے ہیں ندی، تالاب جھرنے،
کھول اُٹھتے ہیں سمندر اور ہوائیں
سر برہنہ جنگلوں میں چیختی ہیں
چیختے ہیں پیڑ پودے، اور شاخیں،
اپنے پتّوں سے گریزاں،
یوں خلا میں گھورتی ہیں،
جیسے اب اُن کے لیے کچھ بھی کہیں باقی نہیں ہے

اپنے پیلے ناخنوں سے
چیر کر سینہ کنواری خامشی کا
جب یہ اس کے خون سے اپنے بدن کو سینچتا ہے
کانپ اُٹھتی ہیں فضائیں
کٹ کے اپنے آپ سے جانے کدھر کو
بھاگنے لگتی ہیں آدھ ننگی دِشائیں
اور ہمالہ
برف کے ٹھنڈے لحافوں میں دُبک کر
ہانپتا ہے،
"جاؤ! جاؤ!
دُھوپ، سورج، گُل مہر، آکاش!
سب جاؤ یہاں سے
سب چلے جاؤ یہاں سے!"

یہ میرا دشمن، میرا اندھا سہودر
دھرتی ماں کی کوکھ کا ناسُور
میرے ساتھ جب پیدا ہوا تھا
آسماں کا رنگ
اُسی دن ہی تو نیلا پڑ گیا تھا

مَیں فقط نو سال کا تھا
جب ہمارے گاؤں پر پہلے پہل
یہ بڑا سا آسیب اُترا۔
اور مَیں اپنے ہم جماعت ساتھیوں،
احمد، لیاقت، فاطمہ، اقبال کو
خورشید کو بھی
مینہہ برستے بھیگتی پگڈنڈیوں پر چھوڑ کر
جانے کہاں کو چل دیا تھا
مُڑ کے دیکھا تھا تو اس عفریت کے
پیروں تلے تھا،
خون میں تبدیل ہوتا،
پانچ دریاؤں کا پُر آشوب پانی
جو خود اپنے آپ پر تقسیم ہو کر
منفی و مثبت کے چکّر میں پھنسا تھا
آج تک گویا کہ ویسے ہی پھنسا ہے۔

یہ میرا دشمن، میرا اندھا سہودر
جو کسی تیسرے میرا ہمزاد بھی ہے
تیرے [illegible] کو [illegible] کا [illegible] دیتا ہوا

دانتوں کو اپنے کٹکٹا کر بھینچتا ہے،
اس کی ہر اک سانس میں
سو اژدہے پھنکارتے ہیں
سوکھ جاتے ہیں ندی، تالاب جھرنے،
کھول اُٹھتے ہیں سمندر اور ہوائیں
سر برہنہ جنگلوں میں چیختی ہیں
چیختے ہیں پیڑ پودے، اور شاخیں،
اپنے پتوں سے گریزاں،
یوں خلا میں گھورتی ہیں،
جیسے اب اُن کے لیے کچھ بھی کہیں باقی نہیں ہے

اپنے پیلے ناخنوں سے
چیر کر سینہ کنواری خامشی کا
جب یہ اس کے خون سے اپنے بدن کو سینچتا ہے
کانپ اُٹھتی ہیں فضائیں
کٹ کے اپنے آپ سے جانے کدھر کو
بھاگنے لگتی ہیں اَدھ ننگی دِشائیں
اور ہمالہ
برف کے ٹھنڈے لحافوں میں دُبک کر
ہانپتا ہے،
"جاؤ! جاؤ!
دُھوپ، سورج، گُل مُہر، آکاش!
سب جاؤ یہاں سے
سب چلے جاؤ یہاں سے!"

یہ میرا دشمن، میرا اندھا سہودر
دھرتی ماں کی کوکھ کا ناسُور
میرے ساتھ جب پیدا ہوا تھا
آسماں کا رنگ
اُسی دن ہی تو نیلا پڑ گیا تھا

مَیں فقط نو سال کا تھا
جب ہمارے گاؤں پر پہلے پہل
یہ بدنما آسیب اُترا۔
اور مَیں اپنے ہم جماعت ساتھیوں،
احمد، لیاقت، فاطمہ، اقبال کو
خورشید کو بھی
مینہ برستے بھیگتی پگڈنڈیوں پر چھوڑ کر
جانے کہاں کو چل دیا تھا
مُڑ کے دیکھا تھا تو اس عفریت کے
پیروں تلے تھا،
خون میں تبدیل ہوتا،
پانچ دریاؤں کا پُر آشوب پانی
جو خود اپنے آپ پر تقسیم ہو کر
منفی و مثبت کے چکّر میں پھنسا تھا
آج تک گویا کہ ویسے ہی پھنسا ہے۔

یہ میرا دشمن، میرا اندھا سہودر
جو کبھی شاید میرا ہمزاد بھی ہے
جو ہی آتش کو جب گالیاں دیتا ہوا

چکرویوہ

دوست میرے
کرشن کا مانا کہ تم نے نام شن رکھا ہے لیکن
کنس تو کوئی کبھی مارا نہیں ہے

اور نہ تم نے،
دروپدی کی لاج لٹنے سے بچایا
پوتنا دائی، بکاسُر اور کالی ناگ کے
قصوں کا بھی گیتا سے کہ جس میں تعلق ہے
کسی نے آج تک تم کو بتایا؟

جس کو در یودھن سمجھتے ہو
کبھی اس کے گھر یلو یگیہ میں شرکت ہی کی
یا جھوٹے پتّل بھی اٹھائے
تین مٹھی ستّوؤں کی چاہ میں
کیا تم سداما کے کبھی نزدیک آئے؟

دیکھو! دیکھو! پھر وہ میرے سامنے ہے
پھر میں اپنے ہی لہو کی دھار پر بہنے لگا ہوں
اور پھر اس کی برا ذیت
بھیشم کی صورت
کسی کالے مہابھارت کے تیروں پر پڑا
بہنے لگا ہوں
اور وہ میری ذات سے باہر نکل کر
پھر شمالی ہند پر چھانے لگا ہے
پھر مجھے بچپن کا وہ ننگا بھیانک
خواب یاد آنے لگا ہے۔

ہے

ہاں اگرچہ کرشن کو تو اس پہ بھی
تم کو اکیلا دیکھ کر، رتھ سے اترنا ہی پڑے گا
اور تمہارے رتھ کا بھی
ٹوٹا ہوا پہیہ اٹھا کر
وہ تمہاری بھی حفاظت خود کرے گا
کیونکہ تم ارجن بھلے ہی بن نہ پاؤ
کرشن تو اپنوں کی خاطر
کرشن ہی بن کر لڑے گا۔

اور بھی کتنا ہی کچھ،
جو ہے نہیں ہے سے پرے،
لیکن ہماری قوم کے رُوح و رگ و ریشہ،
زمیں کے چپے چپے سے خُدا ہے
کرشن جس کے نام سے ہے
اور جو خود کرشن کا پیغامبر ہے،
جاوداں ہے،
کیونکہ یہ ہندوستاں ہے
کرشن کا مانا کہ تم نے نام سُن رکھا ہے لیکن،
دوست میرے!

اور اس پر بھی اگر
گانڈیوا اٹھانے پر تلے ہو،
تو ذرا سوچو! کہ ارجن کی طرح
جس جنگ میں تم آ کھڑے ہو
دیو پکر۔ اس جگہ
کن اجنبی راہوں سے ہو کر آ رہا ہے
سر بکف ہو کر نکل پڑنے میں
کچھ لگتا نہیں ہے۔
کیونکہ جس کو، دیوہ کی رچنا
سمجھ میں ہی نہ آئے،
وہ مہابھارت کے پتوں پر
زیادہ سے زیادہ
ایک ابھیمنیو رہے گا۔

اک تمھاری میراث ہی نہیں ہے،
ہمارا بھی نام اس کی تاریخ میں لکھا ہے

گئے وہ شاہیں
جو ہم غریبوں کو آئے دن نوچ کھا رہے تھے۔
گئے شکاری، جو نت نئے جال کے ذریعے
یہاں وہاں سب کو انگلی انگلی نچا رہے تھے۔
مگر ہماری اُڑان بھرنے کی ہر سعی پر،
ہزار طرح کی بندشیں آج بھی لگی ہیں
مگر جو اک آسماں ہمارے لیے بنا تھا،
وہ رفتہ رفتہ سمٹ رہا ہے
کہ آدمی آدمی کے ہاتھوں
پتنگ بازی میں کٹ رہا ہے -

ہمارا کیا اور ہماری پرواز کی
فضاؤں پہ دسترس کیا
مگر وہ سب لوگ جو ہمیں
امن کے پیمبر سا کہہ گئے ہیں
نہ جانے کس راہ رہ گئے ہیں
ہمارے طوطے بھی ان بزرگوں کے ساتھ ہی
وقت کی ندی پار بہہ گئے ہیں۔

نئی پُرانی، سبھی طرح کی عمارتوں میں
ہم ان دنوں ایک ساتھ جینے کی

کبوتروں کی عرضداشت

پتنگ بازو! نواب زادو!
یہ لکھنؤ ہے
یہاں کی تہذیب دوستو!

اک تمہاری میراث ہی نہیں ہے،
ہمارا بھی نام اس کی تاریخ میں لکھا ہے

گئے وہ شاہیں
جو ہم غریبوں کو آئے دن نوچ کھا رہے تھے۔
گئے شکاری، جو نت نئے جال کے ذریعے
یہاں وہاں سب کو انگلی انگلی نچا رہے تھے۔
مگر ہماری اڑان بھرنے کی سرحدی پر،
ہزار طرح کی بندشیں آج بھی لگی ہیں
مگر جو اک آسماں ہمارے لیے بنا تھا،
وہ رفتہ رفتہ سمٹ رہا ہے
کہ آدمی آدمی کے ہاتھوں
پتنگ بازی میں کٹ رہا ہے۔

ہمارا کیا اور ہماری پرواز کی
فضاؤں پہ دسترس کیا
مگر وہ سب لوگ جو ہیں
امن کے سپیرا کہہ گئے ہیں
نہ جانے کس راہ رہ گئے ہیں
ہمارے ٹوپرے بھی ان بزرگوں کے ساتھ ہی
وقت کی ندی پار بہہ گئے ہیں۔

نئی پرانی، سبھی طرح کی عمارتوں میں
ہم ان دنوں ایک ساتھ جینے کی

کبوتروں کی عرضداشت

پتنگ بازو! نواب زادو!
یہ لکھنؤ ہے
یہاں کی تہذیب دوستو!

پتنگ بازو!
نواب زادو!
یہ لکھنؤ ہے۔

کوششوں میں لگے ہوئے ہیں
ہمارا سب رنگ و نسل کا
امتیاز بھی کب کا مٹ چکا ہے
کہ ہم فقط آدمی کے دکھ میں
اُداس آنکھوں جگے ہوئے ہیں —

کوئی علاقہ ہو، شہر ہو، مُلک یا جزیرہ،
ہمارا پیغام تو سدا
امن و آشتی تھا
ہے اور رہے گا
ہمارا ہر خواب آدمی کی
سلامتی کے لیے بنا ہے، بنا رہے گا
ہمارا جنگل سے کچھ نہیں واسطہ
اگر ہو بھی تو ہمیں علم ہے
کہ ہم کرۂ زمیں پر
بغیر انسان کہیں بھی زندہ نہ رہ سکیں گے
ہمارے حق میں
حدوں کا جس طرح کا تعین بھی
لوگ چاہیں،
ہم اُن حدود کی خلاف ورزی،
کسی بھی صورت نہیں کریں گے۔
تمھارے بچوں کی خیریت کی
دعائیں اپنے پروں پہ لکھ کر
تو ہم سمجھتے ہیں آج تک ہم

مجھ کو معلوم ہے تم وہی لوگ ہو

مجھ کو معلوم ہے یہ جو سڑکوں پہ بکھرا ہوا ہے لہو
یہ جو ماحول دہشت زدہ ہے یہاں
یہ جو گلیوں میں ہے سوگ چھایا ہوا
یہ جو آکاش کو چھو رہا ہے دھواں
اُٹھ رہی ہیں جو لپٹیں وہاں آگ کی
یہ سبھی کچھ تمہارے کیے سے نہیں
اس کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہے

لیکن اے دوستو!
تم نے سوچا ہی ہے تم نے جانا ہی ہے؟
ان سب اعمال سے، ایسے کردار سے
اپنی منزل کی جانب رواں قوم کو
تم نے لا کر کہاں سے کہاں رکھ دیا

یہ تھکن، یہ اُداسی، یہ افسردگی
گرد آلود چہروں کی دُھندلی فضا!
قوم کے تازہ دم ہونے کے وقت پر
تم نے یہ کیا کیا؟ تم نے یہ کیا کیا؟؟
یہ کوئی وقت تھا آپسی بیر کا؟؟؟
خیر! اب تک تو جو کچھ ہُوا سو ہُوا،
یاد رکھنے کی اب ایک بس اک بات ہے،

آؤ واپس چلیں

تم وہی لوگ ہو
مجھ کو معلوم ہے، تم وہی لوگ ہو
جن کے اجداد کی شہ رگوں کا لہو
مدتوں اس گلستاں کو سینچا کیا
مدتوں کی غلامی کی زنجیر کو
جن کے اجداد نے توڑ کر رکھ دیا
تم وہی ہو کہ جن کے دلوں میں کبھی
اتحاد و اخوت کے جذبات تھے
ہر کڑے وقت پر
جو وطن کی خودی کے محافظ رہے
جن کی پیشانیوں کا پسینہ سدا
خدمتِ قوم میں صرف ہوتا رہا
جن کی سادہ دلی
جن کی زندہ دلی
ہر طرح کی سیاست سے بالا رہی
تم وہی ہو کہ جن کی لغت میں کبھی
بربریت کوئی لفظ تھا ہی نہیں

مجھ کو معلوم ہے تم وہی لوگ ہو

مجھ کو معلوم ہے یہ جو سڑکوں پہ بکھرا ہوا ہے لہو
یہ جو ماحول دہشت زدہ ہے یہاں
یہ جو گلیوں میں ہے سوگ چھایا ہوا
یہ جو آکاش کو چھُو رہا ہے دھواں
اُٹھ رہی ہیں جو لپٹیں وہاں آگ کی
یہ سبھی کچھ تمھارے کیے سے نہیں
اس کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ ہے

لیکن اے دوستو!
تم نے سوچا ہی ہے تم نے جانا ہی ہے؟
ان سب اعمال سے، ایسے کردار سے
اپنی منزل کی جانب رواں قوم کو
تم نے لاکر کہاں سے کہاں رکھ دیا

آؤ واپس چلیں

تم وہی لوگ ہو
مجھ کو معلوم ہے، تم وہی لوگ ہو
جن کے اجداد کی شہ رگوں کا لہو
مدّتوں اس گلستاں کو سینچا کیا
مدّتوں کی غلامی کی زنجیر کو
جن کے اجداد نے توڑ کر رکھ دیا
تم وہی ہو کہ جن کے دلوں میں کبھی
اتحاد و اخوت کے جذبات تھے

ہر کڑے وقت پر
جو وطن کی خودی کے محافظ رہے
جن کی پیشانیوں کا پسینہ سدا
خدمتِ قوم میں صرف ہوتا رہا
جن کی سادہ دلی
جن کی زندہ دلی
ہر طرح کی سیاست سے بالا رہی
تم وہی ہو کہ جن کی لغت میں کبھی
بربریت کوئی لفظ تھا ہی نہیں

عَزمِ تقدّم

یومِ جمہوریت پر اہلِ وطن کے نام

یہ عزم ہم نے کیا تھا کسی زمانے میں
ہم اپنے ملک کو جنت بنا کے دم لیں گے

اُٹھے ہیں دہر میں ہم وقت کی صدا بن کر
تمام سوئے ہوؤں کو جگا کے دم لیں گے

کوئی بھی وقت ہو، کوئی بھی دور ہو،
ملک ہر فرقہ و فرد سے ہے بڑا،
اور اس کے علاوہ بھی اے دوستو!
آدمی تو فرشتوں کی اولاد ہے،
اس کا شیطان بننا مناسب نہیں

چوک، بازار، گلیاں، دفاتر،
سبھی شاہراہیں، دکانیں، ملیں بے اماں،
زنگ کھاتی ہوئی ریل کی پٹریاں
کارخانوں کی دم توڑتی چمنیاں
عالم یاس میں سرگراں کھیتیاں
آدمی اور دھرتی کے پاکیزہ رشتے کی قسمیں
سروں پر اٹھائے ہوئے
ہر قدم پر صدا دے رہی ہیں ہمیں!
"آؤ، ہم بھی جئیں"
"آؤ، ہم بھی جئیں"

یہ ٹھیک ہے کہ زمانے کے ساتھ ہم نے بھی
نئی نگاہ، نئی روشنی کو پایا ہے

چراغِ علم و ہُنر کا طلسم پھیلا کر
ہر ایک گوشے کو بھارت کے جگمگایا ہے

کہیں پہ ہم نے بنائے ہیں ڈیم بجلی کے
عمارتوں کو کہیں تا فلک اُٹھایا ہے

ٹریکٹروں سے کہیں جوت کر زمینوں کو
ہر ایک سوئے ہوئے کھیت کو جگایا ہے

نکال کر نئی سڑکیں ہر اک بیاباں میں
تمام گاؤں کو شہروں سے جا ملایا ہے

طرح طرح کی مشینیں لگا کے شہروں میں
کئی گھروں کو نئے نور سے سجایا ہے

پڑا ہے وقت عدو کو شکست دینے کا
تو سرحدوں پہ بھی جا کر لہو بہایا ہے

زمیں پہ خلدِ بریں کی تلاش میں ہم نے
غرض کہ آگے ہی آگے قدم بڑھایا ہے

جنوں میں آج سراپا چراغ ہیں ہم لوگ،
نقاب رُخ سے سحر کے ہٹا کے دم لیں گے

ہمارے عہد میں نفرت کا کوئی کام نہیں
سبھی کو پیار سے جینا سکھا کے دم لیں گے

کوئی غریب نہ کوئی امیر ہو جس میں
ہم ایک ایسی ہی بستی بسا کے دم لیں گے

نکل پڑے ہیں اُجالوں کو ہاتھ میں لے کر
مقدروں کے اندھیروں پہ چھا کے دم لیں گے

چلے نہ تھے تو کوئی راہ تھی نہ منزل تھی
اور اب چلے ہیں تو منزل پہ جا کے دم لیں گے

ہمیں قسم ہے ہماری وطن پرستی کی
کہ مفلسی کو وطن سے مٹا کے دم لیں گے

یہ عزم ہم نے کیا تھا کسی زمانے میں

ہر آئے سال مگر آج کے مقدس روز
ہم اپنے آپ کو دھوکے میں ڈال دیتے ہیں
کہ اپنے حال کی ہر ناگوار صورت کو
اک اله وعدۂ فردا پہ ٹال دیتے ہیں

سا وقت اس کیفیت میں تمھارا
المون سے گزر ہو رہا تھا۔
نے سوچا نہ تھا سامنے سے
فق آئینہ در آئینہ
رہا تھا

روک کر کچھ کہوں
ک تیر آ کر
س سمایا
تاقب میں بھاگا
ک کر ساتھ آیا

ماری
سکاری

ے رہی ہے
نہیں؟

بستر نہ ہونا!
ور نیچے پڑا

کپل وستو کا راج

اندرا جی کی شہادت پر، راجیو گا

تم اک طے شدہ راستے پر تھے لیکن
مگر تاریکیاں بلندی پہ اتنا خطرناک تھا

اور تم،
اپنی پرواز میں اس قدر مشغول ہو چکے تھے
کہ سمتوں کی پہچان کے ساتھ ہی ساتھ
دوری کا احساس بھی کھو چکے تھے۔

بیک وقت اس کیفیت میں تمھارا
کئی عالموں سے گزر ہو رہا تھا۔
مگر تم نے سوچا نہ تھا سامنے سے
اُفق در اُفق آئینہ در آئینہ
مختصر ہو رہا تھا

تبھی مَیں تمھیں روک کر کچھ کہوں
پیشتر اس کے اک تیر آکر
تمھارے پروں میں سمایا
شکاری تمھارے تعاقب میں بھاگا
بہت دُور تک بھاگ کر ساتھ آیا
فضا میں ابھی تک
اسی تیر کی سنسناہٹ ہے طاری
کہ جس سے بندھا ہانپتا ہے شکاری
بلندی سے گرتا ہوا
قطرہ قطرہ لہو کون روکے ؟
زمیں پھر بھی شانہ بہ شانہ
تمھیں اپنے آغوش کا واسطہ دے رہی ہے
"اُتر آؤ! اب اور اُڑنا مناسب نہیں"
ہر قدم یہ صدا دے رہی ہے،

مگر تیر کی نوک پر یوں ٹکے
جان کے خوف کو تم میسّر نہ ہونا!
یہاں سے ذرا دور نیچے کھڑا

کپل وستو کا راج ہنس

اندراجی کی شہادت پر، راجیو گاندھی کے نا

تم اک طے شدہ راستے پر تھے لیکن
گھٹا تاریکیاں بلندی پہ اتنا خطرناک تھا

اور تم،
اپنی پرواز میں اس قدر مبتلا ہو چکے تھے
کہ سمتوں کی پہچان کے ساتھ ہی ساتھ
دوری کا احساس بھی کھو چکے تھے .

دھار تھ تم کو نہیں پا سکے گا
ے تمھارے وہ جب تک
ں تیر کو کھینچ کر اپنے ہاتھوں نکالے
کی اس کو نظر کون دے گا؟
وستو کا شاہزادہ بالآخر!
ے نکل کر تو گوتم بنے گا!!